eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

ڈاکٹر محمد خرم یاسین
لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
محمد ناصر
ایم فل اردو سکالر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

CC BY
OPEN ACCESS

Dr. Muhammad Khuram Yasin **Email:** khuram.yasin@gcwus.edu.pk
Lecturer, Govt. College Women University, Sialkot
Muhammad Nasir
M.Phil Urdu Scholar, Riphah International University, Faisalabad Campus

کئی چاند تھے سرِ آسماں: ایک تہذیبی و ثقافتی جائزہ

AN ANALYSIS OF THE PRESENTATION OF CULTURE AND CIVILIZATION IN "*KAI CHAND THEY SAR-E-AASMAN*"

ABSTRACT

The novel "Kai Chand Thy Sar-e-Asman" written by a famous critic, researcher, poet, short story writer, translator and writer "Shams ur Rehman Farooqi" was derived from the eventual history of the Subcontinent during the 18th and beginning of 19th century; including the era of British Imperialism and demise of Mughal Empire. The events occur and excel around the main character "Wazir Begum" with the blend of the Urdu language and multicultural civilization of the 18th century. Therefore, this novel, which is deeply rooted in the culture and civilization of its era, could also be seen as a socio-cultural document. In this article, the analysis of culture and civilization presented in the novel is brought into the limelight".

KEYWORDS

Ghalib, Nawab Shams-ud-Din, Dagh Dehalvi, Kishan Gardh, Sher-e-Shor Angaiz, Wazeer Begum.

عصرِ حاضر میں اردو کی ہمہ جہت شخصیات کا ذکر کیا جائے تو شمس الرحمن فاروقی ان میں سرِ فہرست دکھائی دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف تحقیق و تنقید کا معتبر حوالہ ہیں بل کہ شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ترجمہ نگاری اور لغت نویسی کے حوالے سے بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب پر تحقیق و تنقید، غالبیات، فکشن، تراجم، عروض اور لغات کے حوالے سے متعدد متنوع الجہات کتب تحریر کیں، جن میں سے "تفہیمِ غالب" (۱۹۸۹ء) "شعر شور انگیز" اور "کئی چاند تھے سرِ آسماں" (۲۰۰۶ء) نے انھیں شہرتِ دوام بخشی۔ اسی سبب انھیں ان کی زندگی ہی میں اردو ادب کی خدمت اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جن اعزازات سے نوازا گیا ان میں اردو اکیڈمی (اترپردیش)، کل ہند کریمیہ سوسائٹی، جمشید پو، دہلی اردو اکیڈمی لکھنو، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، بھارتی فن کار سوسائٹی، آل انڈیا میر

اکیڈمی، پالیمرسٹی زن سوسائٹی امریکہ، ساہتیہ اکیڈمی نئی، مولانا آزاد نیشنل ایوارڈ آل انڈیامیر اکیڈمی، سرسوتی سمان برلہ فاؤنڈیشن، نئی دہلی کی جانب سے برصغیر کا اعلیٰ ادبی ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ، الہ آباد یونی ورسٹی ایسوسی ایشن ایوارڈ اوراردو اکیڈمی کا سب سے بڑا اعزاز بہادر شاہ ظفر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات نے عصرِ حاضر کے ڈاکٹر علیم الدین، رحیل صدیقی اورڈاکٹر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ایسے اہم ناقدین و محققین کو بھی خوب متاثر کیااور وہ انھیں اپنے مضامین میں سراہتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر علیم الدین کے مطابق:

"وہ بیک وقت ایک بلند پایہ ادیب، جید نقاد، معتبر شاعر، اعلیٰ درجے کا افسانہ نگار، مستند محقق، ماہر عروضی و قواعد اور لغت شناس ہیں اور ہر جگہ انھوں نے ایسا کمال دکھایااور لاجواب فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے کہ دوسرا کوئی ان کا ہم قامت نظر نہیں آتا۔(۱)

جب کہ ڈاکٹر رشید اشرف ان کی خدمات کو ہدیہ تحسین پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ شمس الرحمن فاروقی ایک نابغہ روزگار یا جینئس ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ عبقری، نابغ اور جینئس بنا نہیں کرتے بل کہ پیدا ہوتے ہیں اور یہ کام دستِ مشیت میں ہوتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ قسمت، حالات، ماحول اور ذاتی کوشش کو بھی بڑی حد تک اس میں دخل ہے۔"(۲)

"کئی چاند تھے سرِ آسماں" ایک تاریخی ناول ہے اور ۱۸۱۱ء سے ۱۸۵۶ء کا درمیانی عہد گرفت میں لیتا ہے۔ یہ وہ عہد تھا جس میں برصغیر میں ہزاروں سال میں پنپنے والی قدیم تہذیب و ثقافت زندہ تھی۔ اس میں گنگا جمنی کے ساتھ ساتھ، ایرانی اور افغانستانی بادشاہوں، حملہ آوروں کا بھی حصہ شامل تھا، برصغیر کے پہلے باقاعدہ مسلمان حکمران قطب الدین ایبک کی صورت میں ترکی ثقافت کے نشانات بھی موجود تھے، محمد بن قاسم کی صورت میں عراق و بغداد کی مسلم ثقافت کی بھی کچھ کچھ علامات باقی تھیں، جدید ترین ہند مغل جمالیات کا نیا روپ بھی موجود تھااور اور یورپ سے آنے والے نئے حاکمین بھی اس میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ بہر حال ناول میں زیادہ تر مغلیہ عہد اور ہند اسلامی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ گرچہ یہ تاریخی ناول ہے لیکن تاریخ اور فکشن کے حقیقی بُعد کے تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے مکمل تاریخی ناول کی غرض سے پڑھنے کے بجائے تہذیبی مطالعے کو پیشِ نظر رکھنے کو ترجیح دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ بات واضح کر دوں کہ اگرچہ میں نے اس کتاب میں مندرج تمام اہم تاریخی واقعات کی صحت کا حتی الامکان مکمل اہتمام کیا ہے، لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔ اسے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہو گا۔" (۳)

ناول بنیادی طور پر نواب مرزا خان داغ دہلوی کی والدہ "وزیر خانم" کے گرد گھومتا ہے اور اس کا آغاز اس کے دادا میاں مخصوص اللہ کے خاندان سے ہوتا ہے۔ جس میں کشن گڑھ کے راجہ کی طرف سے ان کے خاندان کی جلاوطنی، نئے وطن میں مختلف پیشے

اختیار کرنا، تین بیٹوں داؤد، یعقوب اور یحیٰی کی پیدائش، پھر آگے نسل میں سے محمد یوسف کی پیدائش اور اس کا طوائف اکبری کی بیٹی سے شادی ہونا جس کے نتیجے میں اولاد میں تین بیٹیوں انوری خانم عرف بڑی بیگم، عمدہ خانم عرف منجھلی بیگم اور وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کی پیدائش شامل ہے۔ ان تینوں میں سب سے چھوٹی وزیر خانم تھی جس سے درحقیقت اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے لیکن اس سے قبل اس کے خاندان کے آباؤاجداد کا ذکر اور دادا کی وفات بھی نہایت خوبصورتی اور چابک دستی کے ساتھ ناول بیان کی گئی ہے۔ ناول میں وزیر بیگم کی زندگی کو مشکلات سے عبارت دکھایا گیا ہے جس کا سبب اس کا وہ ملکوتی حسن و رعنائی ہے جس پر امیر اور صاحبِ اقتدار فریفتہ رہے۔ وزیر خانم ایک ایسی لڑکی ہے جسے اپنی خوبصورتی کا احساس بچپن ہی سے تھا۔ وہ اس خوبصورتی کو استعمال میں لا کر کسی امیر زادے کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی حادثاتی ملاقات حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دینے کے بعد آتے ہوئے پولیٹیکل سروس کے ملازم مارسٹن بلیک سے ہوئی جس نے انھیں آندھی طوفان میں بھی بحفاظت گھر پہنچادیا اور یہیں سے ان دونوں کی محبت پروان چڑھی۔ اس محبت میں وزیر خانم اسی کی ہو کر رہ گئی لیکن مارسٹن بلیک کے قتل کے ساتھ ہی نہ صرف اس کی عیش و عشرت ختم ہوگئی بل کہ انگریز خاندان نے اس سے اس کے بچے صوفیہ اور مارٹن کو بھی چھین لیا۔ اس کے بعد اس پر ایک اور انگریز افسر ولیم فریز فریفتہ ہوا لیکن وزیر خانم نہ صرف اسے منھ نہ لگایا بل کہ ایک معروف نواب شمس الدین سے بھی محبت بڑھالی۔ یوں ان دونوں مردوں کی چپقلش بڑھنے پر نواب شمس الدین نے ولیم کو قتل کر دیا۔ جرم ثابت ہونے پر نواب کو انگریز سرکار نے پھانسی کا حکم دے دیا۔ نواب کی طرف سے وزیر خانم کے ہاں مرزا خان داغ دہلوی کی پیدائش ہوئی پھر اس کا نکاح تراب علی رام پوری داروغہِ فیل خانہ سے ہوا لیکن قسمت ایک بار پھر سے وزیر خانم کو دھوکا دے گئی اور تراب علی بھی ٹھگوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ وزیر بیگم سب کچھ چھوڑ کر دلبر داشتہ ہو کر واپس دلی چلی آئی اور یہاں اس کا نکاح بہادر شاہ ظفر کے تیسرے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر سے ہو گیا البتہ شاہی ولی عہدوں کے انتقال کے بعد انھیں پھر سے محل سے نکال دیا گیا۔ یوں تاریخی اور تہذیبی حوالے سے اس ناول میں ہند مغل جمالیات اور ہند مسلم ثقافت کا تہذیبی و تاریخی شعور بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔ ناول کی کتابیات سے پتہ چلتا ہے کہ اس ۸۲۱ صفحات کے ناول کی تیاری میں شمس الرحمن فاروقی نے ۳۰ اردو اور ۱۱۴ انگریزی کتب کا سہارا لیا ہے۔

یہ ناول متنوع اور کثیر الجہت تہازیب کا ایک گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں کہیں مغلیہ دربار سے منسلک رسوم رواج، نشست و برخاست کے نمونے دکھائی دیتے ہیں، کہیں دہلی اور لکھنو کی تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں، کہیں مختلف پیشوں اور اور ان سے منسلک لوگوں کے حالات و واقعات جزئیات نگاری کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو کہیں محلاتی سازشیں، فنونِ لطیفہ میں موسیقی، رقص، شاعری اور شبیہ سازی کے نمونے نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی چوں کہ قدیم اردو، اس کے مختلف لہجے، فارسی روزمرہ، اور تہذیب و ثقافت سے مکمل واقف تھے، اس لیے انھوں نے منظر کشی اور مکالمہ نگاری کرتے ہوئے، ان سب کا بہترین استعمال کیا ہے۔ کئی الفاظ اور تراکیب ایسی

ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے لغات کا سہارا لینا پڑتا ہے جب کہ کئی مقامات پر فارسی سے ناواقفیت کی بنا پر متن کے ابلاغ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً وزیر خانم کے سفر کا ایک حوالہ ملاحظہ کیجیے:

"وزیر خانم کی بہلی کا ایک دھرا گھستے گھستے ذرا مخدوش ہو گیا تھا اور خوف تھا کہ بیلوں کو اگر تیز دوڑایا گیا تو دھرا ٹوٹ سکتا ہے۔ ان کی بہلی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، یہاں تک کہ ساتھ کے تمام مسافر، خواہ وہ بہلیوں پر تھے یا تام جھام یا پالکیوں پر، آگے نکل گئے۔ فیل نشین، شہسوار، سانڈنی سوار و بگھی سوار تو پہلے ہی یہ جاوہ جانظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔"(۴)

درج بالا پیرا گراف میں دھرا، جتے ہوئے بیلوں پر سواری کرنا، بہلی، تام جھام، پالکیاں، فیل نشین، شہسوار، سانڈنی سوار اور رو بگھی سوار تمام ذرائع سفر کا جزو لاینفک اور اس تہذیب کے لوازمات میں سے تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سب ختم ہو چکے ہیں۔ دوسری جانب انگریز سرکار کے افسر مارسٹن بلیک کی سواری کا احوال ملاحظہ کیجیے جس سے اس کے "رتھ" کے شان و شوکت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا جو کہ اس وقت کی تہذیب کا اہم حصہ تھی۔

"مارسٹن بلیک کے قافلے میں، جو عازم جے پور تھا، آرائش اور گوٹے ٹھپے سے جگمگاتا ہوا اور تازہ پھولوں کے گجروں سے لٹکتا ہوا اور تازہ ہری ترہات سے ہریالا بنا ہوا ایک رتھ بھی تھا وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم زرق برق حجلۂ عروسی میں محل اس میں سوار تھیں۔(۵)

شمس الرحمن فاروقی نے ناول میں تہذیبی استعاروں کے استعمال کی غرض سے مختلف مناظر میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے جسے وہ روایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے ناول کا کوئی بھی منظر تہذیبی جزئیات کے بنا مکمل دکھائی نہیں دیتا۔ ادب سے جڑا ایک منظر ملاحظہ کیجیے جس میں ان کے اپنے جذبات بھی شامل ہیں تاکہ منظر کی سحر انگیزی مزید بڑھ جائے:

"کیسی کششیں ہیں اور کیسے جوڑ۔ صرف ایک دو دوارے اور نہ جانے کتنی کششیں۔ مرگ، نیست، شبے اور بے خوابیم کو بھی یوں لکھا تھا کہ "بے" اور "خوابیم" میں بھی کشش ڈال دی تھی۔ اور علم کی طرح دل میں کھبتے ہوئے "این" اور "آں" اور "افسانہ" کے الف۔ این نیست آن شبے کہ بہ افسانہ بگزرد کیا پراسرار بات ہے اور اس موقعے پر تو اور بھی رمزناک معلوم ہوتی ہے۔"(٦)

عہدِ گزشتہ میں کسی بھی راجہ مہاراجہ کی اپنے محکوم دیہات آمد پر اسے خوش آمدید کہنے کے لیے مخصوص رسوم و رواج موجود تھے۔ لوگ دل و جان سے اس کے استقبال کے لیے جمع ہوتے اور گھر ہی نہیں سارے گاؤں کو دلہن بنا دیا جاتا۔ ایک ایسے ہی "مہاراول" کی گاؤں میں آمد کو بیان کرتے ہوئے اس کا جاہ و جلال، دروازے کی دہلیزوں کی صفائی، گھروں کے باہر پانی کا چھڑکاؤ، دیواروں پر تصویروں کا آویزاں کرنا، چوکھٹ کے آگے رنگولیاں بنانا اور جگہ جگہ مور پنکھیاں لٹکانا شامل ہے۔ اس کی بیٹی کی اس کے ساتھ آمد کا احوال بھی کسی

قیدی اور مجبور خاتون کی بے بسی کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وقت خواتین کے پردے کے اہتمام کے لیے کیا کچھ ضروری تھا اور ان کا اوڑھنا بچھونا کیسا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

"مہار اول کی سواری کے پیچھے ایک محافہ، بے پردہ۔ بے پردہ محافہ۔۔۔ اور من موہنی اس میں بے چادر اور جوتی۔ ناک ہاتھ پاؤں زیوروں سے عاری۔ منھ پر سرکی کا نشان نہیں، لیکن سر اٹھائے ہوئے۔"(۷)

ناول میں تاریخ و تہذیب ہم قدم دکھائی دیتے ہیں۔ برصغیر کی تہذیب و ثقافت کے ایسے بہت سے ایسے الفاظ اس میں موجود ہیں جو ناپید ہو چکے ہیں۔ بیٹی پر بے پردگی کے الزام کے بعد باپ کا اسے غیرت کے نام پر قتل کرنا آج بھی برصغیر کا رواج ہے۔ مہار اول کا اپنی بیٹی کو قتل کا کرنے کا انداز ملاحظہ کیجیے جس کی جزئیات نگاری میں شمس الرحمن فاروقی نے پوری چابک دستی سے کام لیا ہے۔

"گجندر پتی مرزا عربی مشکی پر سوار پیچھے ہٹتا گیا، یہاں تک کہ وہ من موہنی سے کوئی دو سو قدم کی دوری پر جا کر ٹھہرا۔ اس نے نیزے کو گھوڑے کی پشت و شکم کے متوازی کر کے دوسرے ہاتھ میں ڈالا، اس طرح کہ نیزے کی انی کا سرا گھوڑے کی کنوتیوں کے بیچوں بیچ آ گیا۔ پھر اس نے میان سے تلوار نکالی، ہتھوانس کر اس نے بازو پھیلا دیا۔ دیکھنے والوں کو لگا جیسے کسی آسمانی عقاب کا شہپر اس کے پنجے میں اگ آیا ہو۔ گھوڑے کو ہلکی مہمیز لگی، تلوار اور بازو ساکت اور سخت تھے۔"(۸)

ناول کو چوں کہ واقعاتی انداز میں آگے بڑھایا گیا ہے اس لیے اس میں کئی پیراگرافوں میں پرزور مکالمے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مکالمہ بنیادی طور پر کسی بھی شخص کی تاریخ و تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ذیل میں ایک پیراگراف ملاحظہ کیجیے جس میں ایک مرد اور عورت کی رشتے کے سلسلے میں چپقلش جاری ہے۔ مرد عورت کی جانب ملتفت ہے اور عورت اس سے سوال و جواب کر رہی ہے۔ اس ایک مکالمے میں اس دور کے بہت سے پیشوں، رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں متصدی، احدی نفری، کشتی بانی، ہاتو کا بھی ذکر ہے اور عورت سے لیے کھیتی باڑی میں لیے جانے والے کام کا بھی۔ ملاحظہ کیجیے:

"لکھے پڑھے تو ہو نہیں کہ کچہری دربار میں متصدی ہی لگ جاتے۔ دھان پان ہو، احدی نفری کا کام کر نہیں سکتے۔ ہاتو بننا یا کشتی بانی تمھارا خاندانی کام نہیں۔۔۔ میں کوئی تیرا کشمیری مربھکا نہیں ہوں۔ کشن گڈھ کا چتیرا ہوں۔ بس ہاتھ اٹھانے کی دیر ہے اور تیرا یہ گورا رنگ، یہ نازک ہاتھ پاؤں میرے کس کام آئیں گے۔ میرے گھر کی ہوتی تو تیرے ہاتھ میں ایک کلہاڑی پکڑا دیتا، سر پر پلاس کی بڑی سی جھابی اور دس گز کا رسا رکھ دیتا۔ دن بھر میں ایک دو سانپ بچھو تجھے کاٹتے لیکن تو ہفتے بھر کا سوختہ تو بٹور لاتی۔ اب یہاں کی بھیگی پھسلواں پہاڑیوں پر تو اونچے اونچے پیڑ کیا کاٹے گی کہ گھر میں چولھا جلے۔ یہاں تو جھڑ بیری نہ جنگلی جلیبی نہ مہندی نہ مولسری۔"(۹)

ناول میں جا بجا مسلم تہذیب کے نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں اور یہ دیگر تہازیب میں مدغم ہوتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً مخصوص اللہ کا مسجد میں جانا، وضو خانے، استنجا خانے کا استعمال، نماز کی ادائیگی، قرآن خوانی، نعت خوانی اور ایک نماز سے دوسری تک کا

انتظار کرنا وغیرہ کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ مخصوص اللہ کا مسجد سے بزرگ کے ساتھ قالین بافی کے کارخانے کی جانب جانا اور وہاں کا منظر ملاحظہ کیجیے جس میں شمس الرحمن فاروقی کی جزئیات کو محفوظ کرنے کی شعوری کاوش نظر آتی ہے۔

"مسجد کی گلی سے نکلیں تو ایک بڑی سی حویلی ملتی تھی۔ حویلی تھی کہ کہ خانقاہ تھی، کہ کارخانہ تھی، سب کچھ یک جا لگ رہا تھا۔ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جس کے چوبی فرش کا زیادہ تر حصہ قیمتی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فضا میں عطر، زعفران کی خفیف سی مہک تھی۔ اوپر شمعوں کے بجائے چیڑ اور سفیدے کی شاخوں کو کہیں مشعل، کہیں شمع کی صورت دے کر روشن کر دیا گیا تھا۔ چوبی شمعوں اور مشعلوں کی مہک، ان کا ہلکا سا دھواں، ان کے چٹک کر جلنے کی آوازیں، موسیقی سے لبریز، مگر دھیمی، دس دس بارہ بارہ کے جتھوں میں فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی آہستہ گفتگو کی ریشمی لہراہٹ، ان سب نے ماحول پر ایک ناقابل بیان لیکن شدت سے محسوس کیفیت کی چادر ڈال دی تھی۔"(۱۰)

درج بالا پیراگراف میں مسجد، حویلی، خانقاہ، کارخانہ، چوبی فرش، قالینیں، عطر، زعفران، شمعیں، مشعلیں، موسیقی وغیرہ کا بیان در حقیقت اس تہذیب و ثقافت ہی کا بیان ہے جس میں قالین بافی کی صنعت کو سیکھا اور سکھایا جاتا تھا اور استاد کو ایسا روحانی درجہ دیا جاتا تھا گویا نہ صرف استاد بلکہ باپ اور پیر و مرشد تک ہوتا تھا۔ استاد اپنے شاگردوں کو قالین بافی کے لیے خصوصی "تعلیم" دیتا جس کا مخصوص انداز ہوتا جس میں وہ سوال کرتا اور شاگرد ہم زبان ہو کر جواب دیتے۔ یہ سوال وجواب وہ "تعلیم" تھی جس نے برصغیر کو قالین بافی کی صنعت میں دنیا بھر میں ممتاز کیا۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس قالین بافی کے بنیادی نمونے (ڈیزائن) تک کو ہندسوں اور انگریزی الفاظ کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ "تعلیم" کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے جس میں استاد شاگردوں سے مخاطب ہے:

"ناگ پھنی کا دودھ پینے اور سوسمار کا گوشت کھانے سے یہ فن نہیں آتا، سمجھے میرے راجپوتی گنوار؟ پھر استاد تم م حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا، "سنو اے احمق ہنگولوں کی اولا دو، ایک راجا تھا پرانے وقتوں میں۔ بڑا احمق لیکن فن کا دلدادہ، اور اس ک وزیر تھا بے حل عقل مند۔ سنتے ہو تبتی بدھ پنتی عورتوں کی یاد گارو؟"(۱۱)

اسی طرح ایک بچے کی پیدائش کے وقت جو مخصوص ماحول برصغیر کی تہذیب کا حصہ رہا ہے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے بھی اس میں زچہ و بچہ کے حالات، زچہ خانہ، دردِزہ، دائی جنائی، مبارک باد، گانے بجانے کا شور، کان میں اذان، ماں کا دودھ اترنا، چھٹی نہانا، دربار پر منتیں کرنا، تعویز لکھوانا، رسم بسم اللہ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول میں ایسے الفاظ کی بھرمار ہے جن کا تعلق برصغیر کی تہذیب و ثقافت سے جڑا رہا ہے ان میں بلوہ، برچھیت، تکفین و تدفین، مزبلے، مغلانی، از کار رفتہ، داروغہ، شنجرفی، سنگت، مربھکا، چتیرا، ہنگولا، ہم چشم، لولاب، ڈوم، پراگ، پاپیادہ، زنا شوئی، نگچی، مشکی، مرافعہ، تطاول، دُھن، ٹھگ، لونڈی، قحبہ، بنسبلوچن، حرف شناس، قرطاس، پھرن، منڈکری، بنسلوچن، یوس، خطاط، بیساکھی، ہیرامن، کنٹھے، بارہ دری، چھاگل تقطیع، انگول، اوڑھنی، خطاط، شہنشاہ، ڈانڈی، مدھ ماتیاں، طومار، سنگھاسن، تبرک، ، مہندس، وزیر، مغنی، اپلچ، چھچھلی، سادہ کار، نچنی، تام جھام،

طاق، طاؤس، گانجا، مقیش، اوڑھنی، پلو، نقش نگار، دہلیز، انگول، تقطیع، کوس، پچا کچی، سمور، قلیچ، دانگ، تاجپوشی، تخت نشینی، نقار خانہ، پنجہ کش، دیوان عام، لوح نویسی، داروغہ، کلس، مائیکہ، سیتلا ماں، بھٹیاری، پن بھرنیاں، ایڑ، گاگر، لعبتان، فال، جراح، مشک، خیلا، گاتیاں، جگت، ہیزم، نوروز، انگرکھا، کلاونت، مہنال، کیوڑہ، تارکشی، قلماقنی، مورچھل، طائفہ، انترا، پیچوان وغیرہ شامل ہیں۔ اسی ضمن میں مہاداجی سندھیا کی شاہی قلعے میں آمد اور انعام واکرام کا منظر ملاحظہ کیجیے:

> پیشوا نے سندھیا کو بادشاہ کی طرف سے پانچ بے بہار قوم جواہر اور نو پارچوں پر مشتمل خلعت پہایا، پھر اس کے ہاتھ میں مرصع تلوار دی، دوسرے میں آبنوسی قلمدان مع مہر شاہی رکھا۔ سندھیا نے باہر آکر تخت کے پائے کو بوسہ دیا، پھر مادھوراؤں کا ہاتھ چوما۔ نقیب نے اعلان کیا کہ قلم دان و شمشیر و مہر کے علاوہ بادزن طاؤسی، ایک صندلی زریں، چھ ہاتی مع عماری و نشان، ایک فرس جنگی بھی اعلیٰ حضرت خلافت پناہی ظل الٰہی، فخر دودمان بابری، اخلف من اخلاف نیاگان تیموری، خاقان ابن خاقان، سلطان ابن سلطان، حضرت گہر شاہ عالم بہادر نے شاہ ذانی خلد اللہ ملکی، وادام اللہ سلطانہ نے اپنے فرزند دلبند وکیل السلطنت عالی جاہ مادھوراؤں سندھیا کو مرحمت فرمائے ہیں۔ مبارک سلامت کا غلغلہ پھر بلند ہوا، نقاروں پر چوب پڑی، حاضرین پر گلاب، عطر عبیر کی ہلکی بوچھاڑ ہوئی۔ پھر سندھیا نے اپنے سامنے کھڑے کاتب کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سر سے تانبے کا ایک بھاری خوان اتارا جس میں مخملی زرکار خوان پوش کے اوپر دو فرمان شاہی رکھے ہوئے تھے۔ سندھیا نے جھک کر فرمانوں کو تین سلام کیے، پھر بڑھ کر انھیں لیا، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھا۔"(۱۲)

اسی ناول کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر سہیل عباس خان اور ڈاکٹر تنویر حسین بھی اس میں تہذیبی بازگشت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس ناول میں گنگا جمنی تہذیب کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اس دور میں ہر ڈیوڑھی پر چوبدار، لٹھیت، برچھیت اور دربان ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی ملنے آتا تو وہ آنے والے کو روک کر آواز لگاتے۔ ہر گھر میں مامائیں، اصیلیں، کنیزیں، باندیاں اور مختلف کاموں کے لیے ملازمائیں رکھی جاتی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ یہ سب اہتمام رئیسوں اور افسروں کے گھروں میں ہوتے تھے۔ ملازم اپنے آقا، خاتون خانہ اور مہمانوں کو بات بات میں تین سلام اور سات سلام کرتے اور خاص مہمانوں کو وہی جوتیاں پہناتے تھے۔ مہمانوں کی تواضع شربت، پان، عطر، گلاب اور بھنڈے (حقے) سے کی جاتی تھی۔ جب کہیں کوئی ہرکارہ یا پیغامبر آتا تھا تو اسے انعام دیے بغیر واپس کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شب میں مالک یا مالکن سے شب بخیر اور صبح کو "صبا حکم خیر" کہا جاتا تھا۔ خواتین بگھی یا نالکی میں آتی جاتی تھیں۔(۱۳)

محرم کے آغاز و احترام کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس میں امام بارگاہ، محرم کا چاند، ماتم، مینا بازاروں کا اختتام، ہیرا منڈی (طوائف خانے) کے بالا خانوں سے بھی ماتمی دھنوں کا اہتمام، عزاداری، نوحہ خوانی، تبرک، تعزیہ، مسجد، خانقاہ، خطیبوں اور واعظوں کا فضائل و مصائب اہل بیت کا بیان وغیرہ شامل کیا گیا ہے۔ اس میں مرثیہ خوانی کا انداز بھی ان مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قاری کے سامنے سارا منظر گھوم جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے یوم پیدائش پر بھی اس وقت کی وہ تہذیب و روایت بیان کی گئی ہے جو عیسائی گھرانوں میں

آج بھی زندہ ہے اس میں ہر طرف خوشیاں، گرجا گھر میں گھنٹاں بجنا، تحفوں اور مٹھائیوں کا تبادلہ وغیرہ شامل ہے۔یوں ناول میں "مسلم تہذیب" کے ساتھ ساتھ "مشرقی تہذیب"، "مغربی تہذیب"، "مغل تہذیب" اور "گنگا جمنی تہذیب" کے عناصر بھی بہت واضح دکھائی دیتے ہیں جن میں عمارات اور ان کا طرزِ تعمیر، اوزار و ہتھیار، مشینیں، ادارے، عقائد، رسوم و رواج، میل جول کے طریقے اور رویے جن میں طرز زندگی، پہننا اوڑھنا وغیرہ شامل ہیں خوبصورتی سے نمائندگی کی گئی ہے۔ مثلاً جب وہ ایک جھگڑے کا بیان کرتے ہیں تو اس میں مشکیں کسنا، پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا، محافظ، تلوار، کپتان، کرنل، طمنچے، گھڑ سوار، قلعہ، تہہ خانے، باز پرس، جیغہ، طرہ اتالیقی، پوجا پاٹ، مہورت، مسند نیشنی، چوبدار، برچھیت، کوتوالی، سپاہی، تھانہ، فیر (گولی چلانا) اور بلوائیوں کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ اس دور کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال واضح ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کے آلات و اندازِ موسیقی کا بیان ملاحظہ کیجیے:

> دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں طاؤس، ایک ایک سنتور نواز اور دف نواز دائیں اور بائیں، تین نوجوان سمرقندی سہ تار لیے ہوئے پیچھے کچھ الگ کھڑے تھے۔ سنتور نواز کے پیچھے ایک بزرگ نے نواز کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نے، لیکن بید کی نہیں بل کہ پیتل کی۔ طاؤس اور سہ تار کو ہم آہنگ کرنے کی مشقیں جاری تھیں۔ نے کی آواز کبھی کبھی بلند ہو جاتی۔(۱۴)

گو کہ کئی مقامات پر تاریخ و تہذیب سے نا آشنائی تفہیمی مشکلات کا سبب بنتی ہے لیکن شمس الرحمن فاروقی نے تاریخی واقعات کو اس خوبصورتی سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کیا ہے کہ نہ تو قاری کی توجہ موضوع سے ہٹنے پاتی ہے اور نہ ہی بین السطور تک رسائی کے مراحل میں کوئی خیال مانع ثابت ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر وہ گویا قاری کا ہاتھ تھامے ان تمام مناظر میں لے جاتے ہیں جو اب عہدِ پارینہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ دعوتِ طعام سے قبل مہمان کی پسند، مزاج پرسی، اور بعد از طعام دل بہلانے کے لیے موسیقی کے شغف کے بارے میں جو تہذیبی روایات تھیں، ان کا بیان ملاحظہ کیجیے:

> "وزیر نے مور چھل ہلانے والی خواص کو اشارہ کیا۔ آن کی آن میں سازاور سازندے آموجود ہوئے اور تین سلام کر کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے آخر میں نسیم جالندھری آئیں، دوہرا بدن، شباب ڈھل چکا تھا لیکن چال ڈھال، نشست و برخاست میں سہج سبھاؤ تھا گویا اسم با مسمیٰ تھیں۔ انھوں نے سات سلام کیے پھر آگے بڑھ کر نواب کے داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا "کیا سناؤں، جناب عالی کی مرضی کیا ہے، فارسی کا کچھ عارفانہ کلام، یا ریختہ کی کوئی غزل؟"(۱۵)

ناول کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں نہ صرف برصغیر کے عہد کی تہذیبی و ثقافتی سطح پر ترجمانی کی گئی ہے، تہذیبی عناصر سے ترتیب دیا گیا ہے، تہذیبی کشمکش موجود ہے بل کہ اس کے میں متنوع تہازیب ایک دوسرے میں مدغم ہوتی بھی نظر آتی ہیں۔ اس لیے اس ناول کو برصغیر کی متنوع تہازیب کا گلدستہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علیم الدین بیگ، مضمون: "ڈاکٹر، شمس الرحمن فاروقی کی شخصیت کے نمایاں پہلو"، مشمولہ: سہ ماہی روشنائی، کراچی، شمارہ ۱۴، جولائی تا ستمبر، ۲۰۰۳ء، ص:۴۱

۲۔ رشید اشرف، ڈاکٹر، "کئی چاند تھے سرِ آسماں ایک تجزیاتی مطالعہ" نئی دہلی: براؤن پبلی کیشنز، 2007، ص:34

۳۔ شمس الرحمن فاروقی "کئی چاند تھے سرِ آسماں"، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۶ء، ص:847۔

۴۔ ایضاً، ص:۱۲۔

۵۔ ایضاً، ص:۱۵

۶۔ ایضاً، ص:۵۱

۷۔ ایضاً، ص:۶۵

۸۔ ایضاً، ص:۶۶

۹۔ ایضاً، ص:۷۱

۱۰۔ ایضاً، ص:۷۶

۱۱۔ ایضاً، ص:۸۲

۱۲۔ ایضاً، ص:۹۷

۱۳- سہیل عباس خان، ڈاکٹر، تنویر حسین، ڈاکٹر، مضمون: "کئی چاند تھے سر آسماں: ایک مطالعہ" مشمولہ: نورِ تحقیق (جلد:۳، شمارہ:۱۲)، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، ص۳۹

۱۴- شمس الرحمن فاروقی "کئی چاند تھے سرِ آسماں"، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۶ء، ص:۱۱۷

۱۵- ایضاً، ص:۲۶۶